جناب محمد شفیق ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی
اسلامیہ کالج۔ پشاور یونیورسٹی

ساورنٹی SOVEREIGNTY
یا
اقتدارِ اعلیٰ کا تصوّر اور مفہوم

——— مغربی اور اسلامی ———

نحمدہٗ ونستعینہٗ ونصلی علیٰ رسولہِ الکریم۔

جب سے پاکستان بنا ہے لفظ ساورنٹی اور اس کے معنیٰ اور مفہوم پر آئینی نقطۂ نظر سے بحث ہوتی رہی ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ساورنٹی کے سلسلے میں دونوں نظریات یعنی مغربی اور اسلامی کا الگ الگ تصوّر پیش کیا جائے۔ تاکہ دونوں نظریات کا تصوّر واضح رہے اور الجھنے نہ پائے اور یہ کہ اگر ہو سکے تو مستقبل کے آئین سازی میں کوئی کام آئے۔

مغربی محققین کی رائے میں "ساورنٹی" کی اصطلاح فرانسیسی زبان کے ایک لفظ سوریرین SOUVERAIN سے ماخوذ ہے۔ جس کے اردو میں معنیٰ بلندترین اور اعلیٰ ترین کے ہو سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فرانسیسی زبان کا یہ لفظ قرونِ وسطیٰ کے ایک لاطینی لفظ "سپرانوس" SUPRANUS سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ جو کہ ایک اسم صفت "سپر" (SUPER) سے بنایا گیا ہے۔[1]

بہرکیف ساورنٹی کے ان لغوی معنوں کے علاوہ جہاں تک اس کے اصطلاحی معنیٰ کا تعلق ہے، مغرب کے سیاسی مفکرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ اصطلاح یورپ کے جاگیرداروں، سرمایہ داروں، اور خوانین کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا آہستہ آہستہ ساورنٹی اور اسکی صفات کا ارتقاء ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اس لفظ نے وہ صورت اختیار کر لی جو اس وقت کے مغربی تاریخ میں پائی جاتی ہے یعنی کہ ایک مطلق وغیر مقید، مکمل وغیر محدود اور اعلیٰ وارفع طاقت واختیار کو کہا جاتا ہے۔

---

1. WEBSTER'S NEW WORD DICTIONARY OF THE AMERICAN LANGUAGE. NEW YORK, 1960 PAGE. 1395.

مغربی تاریخ کا مختصر جائزہ

یہ شک سے بالاتر ہے کہ عیسائیت نے مغرب کے سیاسی ورثہ بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ عیسائیت کا مؤثر پرچار سینٹ پال کے زمانے سے شروع ہوا۔ سینٹ پال اوّل میں ایک کٹر یہودی تھا اور عیسائیت کا سخت ترین مخالف تھا۔ ایک دفعہ دمشق جاتے ہوئے راستے میں عیسائیت کو قبول کر لیا اور دعویٰ کیا کہ ان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ نے انہیں عیسائیت کی دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری سپرد کر دی ہے۔ اس کے بعد سینٹ پال نے عیسائیت کا پرچار شروع کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ سمجھئے کہ عیسائیت بیت المقدس سے نکل کر ایک عالمی مذہب بن گئی۔ خود دوسرے عیسائی پادری سینٹ پال کے اس دعوت و تبلیغ کے مخالف تھے اور ان کی کوشش تھی کہ وہ اس حرکت سے باز آجائیں اور بیت المقدس کی حدود سے باہر کام نہ کریں۔ اس وجہ سے سینٹ پال اور اس کے پیروکاروں پر سخت مظالم ڈھائے گئے مگر وہ اپنے مشن سے باز نہ آئے[2]۔ یہ انہی کی تبلیغ کا اثر تھا کہ ۳۲۴ - ۳۲۷ عیسوی کے دوران قسطنطین اوّل نے عیسائی مذہب قبول کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ عیسائیت کو بھی سلطنت روم کا سرکاری مذہب بنا دیا۔[3]

جب مغربی سیاست کا مطالعہ عیسائیت کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغرب میں عیسائی مذہب اور سیاست کیوں جدا طور پر ترقی پذیر ہوئی اور یہ کہ مذہبی اور سیاسی دونوں اختیارات پوپ کی شخصیت میں کیوں جمع اور متحد نہ ہوئے؟ اس سوال کے کئی جواب ممکن ہو سکتے ہیں۔ اوّلاً یہ کہ روم یا رومیوں کی وراثت میں ایک مضبوط مدنی حکومت کا تصور روایتی انداز میں پہلے سے موجود تھا۔ جو کہ احوال موجود یعنی سٹیٹس کو (STATUSQUO) کو بدلنے کی ہر کوشش کی سختی سے مزاحمت کرتی تھی۔ ثانیاً یہ کہ چرچ کی حکومت ہمیشہ کے لئے گریگری اعظم جیسے مدبر اور منظم بطریقوں کے ہاتھ میں نہ رہی۔ بہت سے پوپ ایسے تھے جو کہ یورپ کے سیاسی معاملات کو اپنی کمزوریوں کے باعث قابو نہ رکھ سکتے تھے۔ ثالثاً یہ کہ عیسائیت کی اصلی روح باقی نہ رہی۔ عیسائی چرچ نے عیسائیت کے مذہبی پہلو کو بہ نسبت دنیاوی پہلو کے زیادہ توجہ دی اور اس طرح کوئی قابلِ ذکر طرزِ حکومت کا تصور پیش نہ کیا۔[4]

---

[2] اس سلسلے میں ملاحظہ ہو سینٹ پال کے خطوط رومن اور گلیشنز کو۔

3. ELLIOT AND MCDONALD, WESTERN POLITICAL HERITAGE NEWYORK, 1949 P.289

4. WESTERN POLITICAL HERITAGE, P. 290-291

عیسائی لٹریچر اس بات پہ گواہ ہے۔ کہ آہستہ آہستہ عیسائی مذہب نے چرچ کو روئے زمین پہ حضرت عیسیٰؑ کی حکومت کا نشان اور مظہر قرار دیا۔ اور پوپ کو چرچ کے سارے اختیارات سونپے گئے یہ اختیارات پوپ کو لوگوں کیطرف سے نہیں ملے تھے۔ بلکہ خود بقول ان کے حضرت عیسیٰؑ کیطرف سے تھے۔ چونکہ اکثر پوپ سیاسی لحاظ سے کمزور اور ناواقف ثابت ہوتے، لہٰذا ایک دوسرا عقیدہ یعنی دو تلواروں (TWO-SWORDS) کا نمودار ہوا جس کا مطلب یہ تھا کہ پوپ کو سیاسی اور مذہبی دونوں اختیارات حاصل ہیں مگر وہ خود اپنی مرضی سے "مذہبی اختیارات" تو اپنے پاس رکھتا ہے مگر دوسرا "سیاسی اختیار" دنیاوی بادشاہوں کے سپرد کرتا ہے۔[5] اس نظریئے کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکمرانوں کو سیاسی اختیار پوپ کیطرف سے ملتا تھا اور ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اپنا سیاسی اختیار پوپ کی مرضی اور منشا کے مطابق استعمال کریں اس طریقے سے پوپ کو بھی یہ اختیار تھا کہ وہ سیاسی معاملات میں جب بھی چاہتا مداخلت کر سکتا تھا۔

بالآخر یہی نظریۂ پوپ اور وقت کے حکمرانوں کے درمیان تنازعہ اور کشمکش کا مبداء بن گیا۔ بادشاہ شارلیمین کی وفات کے بعد یہ اختلافات شدت اختیار کر گئے۔ پوپ یہ چاہتا تھا کہ بادشاہ تمام اہم امور مملکت میں ان سے مشورہ لیں اور بادشاہ اس کا مخالف تھا وہ سیاسی امور میں پوپ کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

یورپ کی تاریخ میں پوپ اور حکمران ٹولے کے درمیان یہی مقابلہ اور کشمکش درحقیقت طویل و تلخ تنازعات کی ایک لمبی داستان ہے۔ جو قرون وسطیٰ کے اوائل میں یورپی دنیا کے ایام پہ چھائے رہے۔ آہستہ آہستہ پوپ اور ان کے درمیان سیاسی اقتدار کے لئے اس کشمکش اور ہاتھا پائی نے رومی سلطنت کے زوال کی صورت اختیار کی اور نیشنل کنگڈم یعنی مقامی اور قومی سلطان نمودار ہوئے۔ مرکزی حکومت کمزور ہوتی گئی اور مقامی سلطان طاقتور اور مطلق العنان ہو گئے۔ چرچ اور حکومت کے درمیان اختلافات شدید تر ہوتے گئے، یہاں تک کہ چرچ کی بعض مذہبی عقائد اور سیاسی امور میں مداخلت کو علی الاعلان چیلنج کیا گیا۔ یہیں سے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔[6]

یورپ کی نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) وہ مشہور تحریک تھی جس کے ذریعے سیاسی معاملات میں مذہب کے عمل و دخل کو ماننے سے انکار کیا گیا، جیسا کہ میکیاولی کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے

---

5. ALFROSS WHY DEMOCRACY HARWARD UNIVERSITY PRESS 1952 PAGE 13.

6. WESTERN POLITICAL HERITAGE, PAGE, 290-292.

چرچ اور سیاست کو جدا کرنے کا مطالبہ پیش کر دیا اور ساتھ ساتھ چرچ پر یورپی زوال کا الزام بھی لگا دیا۔

رینزانس (RENAISSANCE) کی تحریک کیساتھ "تحریک اصلاح عیسائیت" (REFORMATION) بھی شروع ہوئی۔ بلکہ مشہور رائے یہ ہے کہ رینزانس (RENAISSANCE) اور ریفارمیشن (REFORMATION) دونوں متوازی تحریکیں تھیں۔

ریفارمیشن کی تحریک کے ذریعے عیسائی مذہب کی اصلاح کا مطالبہ کیا گیا، اس تحریک کے ذریعے پوپ کی غیر مذہبی اور لادینی طریقۂ کار اور برتاؤ نیز اسکی طرزِ زندگی پر زبردست اعتراضات کئے گئے۔ پوپ کے اعلیٰ اختیارات کو ماننے سے انکار کیا گیا۔ اس طرح کیتھولک چرچ کی وحدت پر ہر طرف سے حملے ہوئے اور دوسری مذہبی تحریکوں کے لئے راہ ہموار کی گئی۔ پروٹسٹنٹ چرچ کی ابتدا اس دور سے ہوئی[7]

ان تحریکوں کا اثر یہ ہوا کہ چرچ اور اس کے طریقۂ کار سے عام نفرت پیدا ہو گئی، لوگ چرچ کی سیاسی معاملات میں مداخلت ماننے سے انکار کرنے لگے اور دوسری طرف قومی اور مقامی سلطانوں نے ان حالات سے خوب فائدہ اٹھالیا۔ اس طرح چرچ کے خلاف عام بغاوت شروع ہوئی۔ یورپ کے سیاسی مفکرین اس بات پر مجبور ہوئے کہ کوئی ایسا نظریہ پیش کر دیں جس میں چرچ اور حکومت کے درمیان اس تنازعے کا حل پیش کر دیا جائے۔ غالباً بودین وہ پہلا سیاسی مفکر تھا جس نے اس وقت کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ قومی سلطانوں کو مکمل اختیارات قانونی تحفظ کیساتھ سونپ دئے جائیں تاکہ وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکیں اور کامیابی کے ساتھ مذہبی تنازعات اور جھگڑوں کو نمٹا سکیں۔ بودین جو فرانسیسی مفکر تھا۔ فرانس کی بقاء و اصلاح اس میں سمجھی کہ وہاں کے مقامی حکمران کو اختیارِ اعلیٰ کا مالک بنا دیا جائے۔ پس بودین نے لفظ "ساورنٹی" یا اختیارِ اعلیٰ کی ایسی تعریف کی کہ جس میں مزاحمت کی کوئی گنجائش نہ رہی، یہ اختیارِ اعلیٰ مقامی حکمرانوں کو دیا گیا اور اس کی نظر میں حاکم اعلیٰ کا امتیازی نشان اس کا یہی حق تھا کہ وہ قانون کو رعایا کی رضا کے بغیر ان پر ٹھونس سکے[8]

جس دوران میں بودین چرچ اور ریاست کے مابین تنازعے کا مطالعہ فرانس میں کر رہا تھا۔ ایک انگریز مفکر تھامس ہابز نے انگلستان کے اندر ہونے والے مذہبی جھگڑوں میں دلچسپی لی۔ ۱۶۴۲ء میں جب جنرل کرامویل نے انگلستان کے مقامی حکمران چارلس اوّل کو شکست دی تو تھامس ہابز نے فرانس میں پناہ لی اور یہاں اپنی

---

7. SPITZ. THE RENAISSANCE AND REFORMATION MOVEMENT VOL. I ST. LEWIS, 1971 CHAPTERS 1-3

8. CRICK. "SOVEREIGNTY" INTERNATIONAL ENCYCLOPEDIA OF THE SOCIAL SCIENCES VOL. 15 PAGE, 79

دو مشہور کتابیں ڈی سیو (DE - CIVE) اور لوائیتھن (LEVIATHAN) لکھیں۔

لوائیتھن میں مقامی حکمرانوں کو قانونی تحفظ دینے کے لئے "معاشرتی معاہدہ" کا نظریہ پیش کر دیا۔ اس نظریئے کے تحت یہ کہا گیا کہ قدرتی حالات میں ہر فرد دوسرے فرد سے نبرد آزما جنگ اور کشمکش کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس سے تنگ آکر ہر فرد نے اپنی حفاظت اور زیادہ تحفظ کی خاطر دوسرے افراد کے ساتھ مل کر اپنے کچھ انفرادی اور قدرتی حقوق کو ترک کر کے ایک شخص یا چند اشخاص کے ایک گروہ کے حوالے کر دیئے جو ان پہ حکومت کر سکیں اور ان کی اور ان کے معاملات، حقوق و منافع کی حفاظت کر سکیں۔ بودین کی طرح ہابز بھی غیر محدود اختیارات اور مطلق العنان بادشاہت کا حامی تھا۔ اس کے خیال میں ایک مطلق العنان مختار اعلیٰ کی موجودگی معاشرہ میں بحالی امن اور لوگوں کو تباہی سے بچانے کے لئے اشد ضروری تھا۔[۹]

بودین اور ہابز کے نظریات کا اثر یوں ہوا کہ مطلق العنان قومی بادشاہ قانونی تحفظ کیساتھ نمودار ہوئے انہوں نے اپنے اختیارات اتنی سفاکی سے استعمال کئے کہ ان مظالم کی داستانیں جو نوع انسانی پہ ڈھائے گئے سن کر انتہائی افسوس ہوتا ہے۔ اختیارات کا بے جا استعمال اور قتل و غارت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ ان حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک انگریز مفکّر لاک (LOCK) اور ایک فرانسیسی مفکّر روسیو (ROUSSEAU) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اختیارات کے اصل مالک لوگ ہیں نہ کہ مقامی بادشاہ۔ روسیو نے فرانس میں لوگوں کی جدوجہد کو دیکھا تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مکمل اختیار لوگوں کا ہے، اور صرف لوگ ہی حسب مرضی معاملات میں تغیر و تبدل کے مجاز ہیں۔ اس طرح وہ لوگوں کی حکومت لوگوں ہی کے ذریعے اور لوگوں ہی کے لئے کا حامی بن گیا۔ پس لاک اور روسیو نے ساورنٹی آف دی پیپل (SOVEREIGNTY OF THE PEOPLE) کا نیا نظریہ پیش کیا جو آہستہ آہستہ ساورنٹی آف کنگز (SOVEREIGNTY OF KINGS) کے نظریئے کا بدل بن گئی۔[۱۰]

اس مختصر سی بحث کے بعد اگر ذرا غور کریں اور ساورنٹی کے مفہوم، معنیٰ اور مقصد پہ سوچیں تو یہ بات فوراً ذہن میں آتی ہے کہ ساورنٹی کا لغوی معنیٰ تو طاقت و اختیار اعلیٰ ہے۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے گرد مغربی قوم کی پوری تاریخ گھومتی ہے اور یہ کہ ساورنٹی کا یہ تصوّر مغرب میں پوپ کے اختیار اور سیاسی طاقت کے خلاف ایجاد کیا گیا اور اسی کو قومی اور مقامی حکمرانوں کا وصف یا حق مانا گیا۔ بنا بریں جب کبھی یورپی تاریخ

---

[۹] MATTERN, CONCEPT OF STATE SOVEREIGNTY AND INTNATIONAL LAW BALTIMORE, 1928 PAGE, 14

[۱۰] CONCEPT OF STATE SOVEREIGNTY AND INTERNATIONAL LAW PAGE, 15-17

میں اس اصطلاح کے بارے میں بحث کی جاتی ہے تو یہ یورپ کی تحریک رینیزانس (RENAISSANCE)
اور ریفارمیشن (REFORMATION) کا حوالہ دیتی ہے جس میں عیسائی چرچ کی وحدت سے انکار کیا گیا۔
پوپ کی طاقت اور اختیار کو چیلنج کیا گیا اور بالخصوص چرچ اور ریاست کی جدائی کا مطالبہ ہوا۔ گویا یورپی تاریخ
میں ساورنٹی کے معنی صرف طاقت واختیار کے نہیں ہے بلکہ اس نظام حکومت کے بھی ہیں جس میں مذہب
اور سیاست ایک دوسرے سے جدا ہوں اور چرچ کو ریاستی امور میں مداخلت کی اجازت نہ ہو۔

وثوق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ساورنٹی کا جو تصور مغرب میں پیدا ہوا اور پھلا پھولا، اسلام میں بالکل اجنبی ہے، اسلامی دنیا کا بہترین مفاد اس میں ترقی پائے گا کہ اس اصطلاح کو قطعاً استعمال نہ کیا جائے۔ اگرچہ اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت ہی قرار دیا جائے کیونکہ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اقوام کی ترقی تیز تر تب ہی ہوتی ہے جب وہ ایسی اصطلاحات کو استعمال کرتے اور ترقی و رواج دیتے ہیں جن کے ساتھ انہیں نفسیاتی اور روحانی تعلق و نسبت ہو۔ تاہم اگر اسلامی دنیا مغرب والوں کو اسلامی سیاسی نظریات اور اسلام میں اختیار حکومت کا تصور بآسانی سمجھانے کی غرض سے یہ درآمد شدہ اصطلاح اللہ تعالیٰ کے بارے میں استعمال کرنا چاہتی ہے۔ تو اپنے مفہوم کی تشریح و توضیح نہایت سوجھ بوجھ اور احتیاط کیساتھ ہونی چاہیئے۔ تاکہ ہر دو نظریات واضح رہیں اور اُلجھنے نہ پائیں۔

اسلام اور ساورنٹی کا تصور اسلام میں ساورنٹی کی اس اصطلاح کے امکان، اس کے مغربی استعمال اور اس کے اسلامی معنی اور اطلاق کے درمیان فرق کی تشریح کی خاطر قرآن کریم کی روشنی در جہ ذیل بحث پیش کی جاتی ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اسلام میں اس اصطلاح کا استعمال کس حد تک ممکن ہے۔ نیز یہ کہ اس بارے میں دونوں نظریات یعنی مغربی اور اسلامی میں کس حد تک اختلاف پایا جاتا ہے۔

توحید باری تعالیٰ اسلام کا عظیم ترین اور اساسی عقیدہ ہے۔ یہ اسلام کا سب سے بڑا انقلابی عقیدہ ہے۔ اسلامی تعلیمات کا لب لباب اس عقیدہ کی پختگی اور قوی ایمان ہے۔ اس کا مفہوم نہ صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ایک وحدہٗ لاشریک ذات ہے بلکہ یہ کہ وہ ہر رخ اور ہر پہلو سے یکتا اور بے مثال ہے اس عقیدے کی جامعیت قرآن کریم کی سورۃ اخلاص میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ○
وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ ○

ترجمہ: تو کہہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے۔ نہ کسی کو جنا، نہ کسی سے جنا۔ اور نہیں اس کے جوڑ کا کوئی۔

یہ سورت ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ واحد اور یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ ذات میں ہے اور نہ صفات میں ہے۔ ہر ہر شے اور ہر ہر ہستی ان کی پیدا کردہ مخلوق ہے۔ وہ ان سب کا خالق ہے، وہ قدیم ہے، ابتدا سے انتہا تک ہے اور ازل سے تا ابد رہے گا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی اصل معبود اور خالق حقیقی ہے اور سارے لوگ اس کے عباد یعنی بندے ہیں۔ سب عبادت اور بندگی اسی کے لئے ہے۔ اور وہی خود بندوں کی پکار کا جواب دیتا ہے یعنی ان کی دعائیں سنتا اور قبول کرتا ہے۔ اسے اپنی کسی مخلوق کی مدد کی احتیاج نہیں بلکہ تمام مخلوق اسکی مدد کی حاجتمند ہے۔ اس کے نہ بیوی بچے ہیں اور نہ ان چیزوں کا محتاج ہے۔ اُسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند اور نہ اسے کھانے پینے کی کوئی حاجت ہے۔ ساری دنیا اور آسمان کی بادشاہی اسی کے لئے ہے۔ اور سب چیزیں اس کے اشارے سے حرکت میں ہیں۔ ہمارے تصوّر میں اسکی کوئی نظیر نہیں وہ کسی شے یا شخص کیطرح نہیں جو ہمارے تصوّر میں آسکے۔ بس وہ اپنی ذات و صفات سب چیزوں میں واحد و یکتا اور بے مثل ہے۔

قرآن کریم میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ۹۹ صفاتی نام ذکر ہیں۔ ان میں ہر ایک اللہ تعالیٰ کے کامل اور اعلیٰ ہونے پہ دلالت کرتا ہے۔ نقائص سے پاک اور عیوب سے بالاتر ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔

(سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۱۰)

ترجمہ: کہہ۔ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جو کہہ کر پکاروگے سو اسی کے ہیں سب نام خاصے۔

اگر اللہ تعالیٰ کی انھی صفات کاملہ پہ غور کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ یہ تمام صفات توحید کے عقیدے کو زیادہ مستحکم بناتی ہیں۔ اور ایمان والوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت اور یکتائی سمجھنے اور بہت سے اوہام جو ان لوگوں میں پائے جاتے ہیں، کو دور کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

شرک توحید کی ضد کو کہتے ہیں، اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو ساجھی بنانا ہے۔ قرآن میں بہت سے مقامات پر توحید خالص کو قائم کیا گیا ہے اور شرک کی تکذیب کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝۔ (سورۃ النساء ایت ۱۱۶)

ترجمہ: بیشک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک کرے اور بخشتا ہے اس سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا اس نے بڑا طوفان باندھا۔

مختصر یہ کہ توحید کے بغیر اسلام رہ نہیں سکتا لیکن شرک توحید کے بالکل منافی ہے ۔ ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا کام توحید خالص کو بحال کرنا اور شرک کی تمام صورتوں اور قسموں کا استیصال کرنا تھا۔ اس کے بعد دنیا و آخرت کی زندگی کے مختلف اداروں اور شعبوں کو توحید خالص کی بنیاد پر قائم کیا۔ قرآن کریم نے قطعی اور حتمی طور پر توحید کے عقیدے اور اسکی اہمیت کو پیش کیا ہے ۔شرک اور اس کی تمام اقسام کی جس طریقے سے تردید اور نفی کی ہے اسکی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

توحید کے سلسلے میں اس مختصر سی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے ۔کہ اسلام میں تمام تر اختیار و قدرت مطلق حتمی، اعلیٰ وارفع اور اکمل ترین صورت میں صرف اللہ ہی کو حاصل ہے ۔ وہ سب لحاظ سے یکتا اور بے مثال ہے۔ دنیا میں اسکی کوئی مثال نہیں اور نہ ہی کسی شے یا چیز کو اس جیسا قرار دیا جا سکتا ہے ۔ وہی مالک حقیقی اور مالک الملک ہے ۔پس ساورنٹی کے معنی اگر صرف طاقت و اختیار کے لئے جائیں تو اس صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں اس قسم کی طاقت و اختیار اپنی کامل و جامع شکل و صورت میں صرف اللہ جل جلالہٗ ہی کو حاصل ہے ۔ مگر جیسا کہ اس سے قبل ساورنٹی کے مغربی تصوّر اور معنی کے بارے میں بیان کیا گیا ہے ۔کہ ساورنٹی کے معنی صرف طاقت و اختیار کے نہیں بلکہ یہ پوری مغربی تہذیب و کلچر کی عکاسی کرتی ہے ۔اسلام میں حاکمیت کا تصوّر مغربی تصوّر حاکمیت سے بالکل الگ ہے ۔ لہٰذا دونوں کی تشریح واضح الفاظ سے ہونی چاہئے ۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الجھانا نہیں چاہئے کیونکہ الجھانے سے پیچیدگی اور غلط فہمی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

قرآن کریم نے اللہ جل جلالہٗ کو ہر لحاظ سے مختار اعلیٰ اور قادر مطلق ثابت کیا ہے جس میں تشریعی وسیاسی دونوں پہلو شامل ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا کنٹرول ہر ہر چیز پر ہے ۔اور کوئی چیز اس کے قابو سے باہر نہیں ہے ۔ قرآن کریم میں ہے :

بَل لِّلّٰہِ الْاَمْرُ جَمِیْعاً ط (سورہ الرعد : ایت ۳۱)

ترجمہ : بلکہ سب کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

اس ایت کریمہ میں اَلْاَمْر کی یہ اصطلاح بہت اہم ہے ۔ایت کا مفہوم واضح ہے کہ ہر حال میں اور ہر کام میں امر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے ۔بنی نوع انسان کی کیا مجال کہ اللہ تعالیٰ کے معاملات میں مداخلت کریں یا (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو بتائیں کہ کیا کریں اور کیسے کریں۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں لفظ امر کی بجائے حکم استعمال ہے ۔ ارشاد الٰہی ہے :

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط (سورہ یوسف : ایت ۴۰)

ترجمہ : حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے ۔

جیساکہ ترجمہ سے واضح ہوتا ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی نے آیت بالا میں لفظ حکم کا ترجمہ حکومت سے کیا ہے جس کا مطلب یوں نکلتا ہے۔ کہ ہر قسم کا اختیار خواہ تشریعی ہو یا سیاسی، اللہ تبارک وتعالیٰ کا حق ہے۔ اللہ کے سوا نہ کسی کا حق ہے اور نہ کسی سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے لئے کبھی تو اَحکم الحاکمین (ہود: آیت ۴۵۔ التین: آیت ۸) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور کبھی خیر الحاکمین (الاعراف: آیت ۸۷، یونس: آیت ۱۰۹، یوسف: آیت ۸۰) کہہ کر پکارا ہے، گویا اللہ تعالیٰ حاکموں کا حکم اور سب سے اکمل وارفع حاکم ہے۔ سارے قوانین وضع کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ مخلوق کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کی ہدایات واحکامات کے مطابق چکائے۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی کرے گا۔ وہ تباہ وبرباد ہی ہوگا۔ قرآن کریم میں ہے:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الکافرون۔ (سورہ المائدہ: ایت ۴۷)

ترجمہ: اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ ہیں کافر۔

اس آیت کریمہ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ دنیاوی حکمرانوں کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق حکمرانی کریں۔ اللہ کے احکام خود اپنے اوپر نافذ کریں اور روئے زمین پر بھی جو حکومت اللہ کے احکامات کو نافذ نہیں کرتی یا انکار کرتی ہے وہ گمراہ اور غلط راستے پر گامزن ہے۔ اس آیت کریمہ پر اگر ذرا مزید غور کیا جائے تو یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مغربی تصور ساورنٹی اور اسلامی تصور حکمرانی میں بڑا فرق یہ ہے کہ مغربی تصور ساورنٹی میں حکمران طبقہ قانون دہندہ بھی ہوتا ہے۔ ان کو قوانین بنانے، رد و بدل اور منسوخ کرنے کا پورا اختیار ہوتا ہے جبکہ اسلامی تصور حاکمیت میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات اصل قانون دہندہ ہے اور حکومتیں اس لئے تشکیل کی جاتی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہی کی ذات مالک الملک ہے وہ سب طاقتوں کا مجموعہ ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (آل عمران: آیۃ ۲۶)

ترجمہ: تو کہہ یا اللہ مالک سلطنت کے، تو سلطنت دیوے جس کو چاہے اور سلطنت چھین لیوے جس سے چاہے اور عزت دیوے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے۔ تیرے ہاتھ ہے سب خوبی۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

یہاں آیت کریمہ میں مالک الملک کی یہ اصطلاح بہت اہم ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ سب بادشاہوں کا بادشاہ حقیقی اور ساری کائنات کا اصل فرمانروا ہے۔

ایک دوسری آیت میں اللہ جل جلالہٗ کی طاقت و اختیار کو ثابت کرنے کے لئے الکرسی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝

(سورۃ البقرہ آیت: ۲۵۵)

ترجمہ: گنجائش ہے اسکی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو اور گراں نہیں اسکو تھامنا اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا۔

پس قرآن کریم اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کرسی سب زمین اور آسمانوں کو احاطہ کئے ہوئے ہے کوئی شے اس کے قبضہ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ اور وہ ہر چیز پہ غالب ہے۔ اس طرح قرآن کریم نے کئی مقامات پہ اللہ تعالیٰ کی طاقت و اختیار کو واضح الفاظ میں بیان کرنے کے لئے لفظ العرش کا استعمال بھی کیا ہے۔

ارشاد باری ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۔ (سورۃ یونس۔آیت)

ترجمہ: تحقیق تمہارا رب اللہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں پھر قائم ہوا عرش پہ۔ تدبیر کرتا ہے کام کی کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اسکی اجازت کے بعد۔

لفظ الکرسی کی طرح العرش کو بھی طاقت و اختیار ونگہبانی کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ العرش اللہ تعالیٰ کی طاقت اور جلال کو ظاہر کرتا ہے یا یوں سمجھئے کہ العرش کائنات کا مرکز (مجازاً) دارالحکومت یا قلب ہے جہاں سے ہر ہر چیز کا کنٹرول ہوتا ہے۔

اوپر کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں ساری طاقت و قوت کا سرچشمہ اللہ جل جلالہٗ کی ذات اقدس ہے۔ سارا تشریعی وسیاسی اختیار اسی کو حاصل ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسلامی حکومت اس کو کہتے ہیں جہاں نظام حکومت قرآن وسنت پہ مبنی ہو جہاں سیاسی، اقتصادی، عدالتی اور دیگر معاشرتی نظامہائے حیات قرآن وسنت کے عین مطابق ہوں اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کا بول بالا ہو۔ اس کے برعکس مغربی تصوّرِ حکومت ہے جہاں عوام کو سارا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ عوام یا عوام کے نمائندے یا حکمران ٹولے کو ہر قسم کے قوانین بنانے کا اختیار ہوتا ہے۔ نیز وہ ایسی طرز حکومت ہے۔ جہاں حکومتی معاملات میں مذہب کے عمل و دخل کو نہیں مانا جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں "ساورنٹی" مغربی تہذیب میں ایک ایسا لفظ ہے جو جب کبھی استعمال ہوتا ہے مغربی ذہنیت اور ان کے طرز حکومت کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔

"ساورنٹی" کے مغربی اور اسلامی تصوّر کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ساورنٹی کے مغربی اور اسلامی تصوّر کے مابین فرق کو واضح کیا جائے اور یہ کہ اس بات کی تنبیہہ کی جائے کہ دونوں نظریات کو ایک دوسرے میں خلط ملط نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اگر وہ صحیح معنوں میں اسلامی آئین چاہتے ہیں تو ان کو اپنے آئین میں کوئی ایسی اصطلاح استعمال نہیں کرنی چاہئے جو عوام کے لئے گمراہ کن ہے۔ اور ملک کے مستقبل کے لئے پریشان کن ہو۔ آئین ملک کے مستقبل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لہذا ہمیشہ ایسی اصطلاح استعمال کرنی چاہئیے جو واضح ہو اور عوام کے دلوں میں گہرے نقوش رکھتی ہو۔ پاکستان سیاسی لحاظ سے جن مشکلات و مصائب سے دوچار ہے اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے آئین میں مختلف قسم کے نظریات کو جگہ دی گئی، اگر ایک طرف اس کے اسلامی ہونے کا دعویٰ ہے تو دوسری طرف اس سے سرمایہ دارانہ نظام اور یہاں تک کہ اشتراکیت کی بھی بو آتی ہے۔ ایک قسم کی پیوندکاری سے کام لیا گیا ہے۔ کچھ چیزیں مغربی ہیں کچھ مشرقی اور کچھ اسلامی بھی ہیں۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد سے جو بھی آئین بنا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء میں جو قرارداد مقاصد پاس ہوئی تھی اس میں بھی یہی خرابی تھی، یعنی جہاں یہ کہا گیا کہ ساورنٹی بیلانگز ٹو اللہ (SOVEREIGNTY BELONGS TO ALLAH) تو وہاں ساتھ ہی "انڈیپنڈنٹ ساورن سٹیٹ" (INDEPENDENT SOVEREIGN STATE) کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اب پہلی اصطلاح کے معنی تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے ہیں۔ یعنی مطلب یہ کہ پاکستان ایک ایسی ریاست ہوگی جس کے سارے قوانین قرآن وسنت سے ماخوذ ہوں گے۔ اور ملک بھر میں قانونِ اسلامی نافذ ہوگا۔ جبکہ دوسری اصطلاح کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک ایسی ریاست ہوگی جہاں عوام کی حکمرانی ہو۔ نیز اسمبلی ہر قسم کے قوانین بنانے اور منسوخ یا ردوبدل کرنے کی مجاز ہوگی۔ یہ تضاد پاکستان کے گذشتہ ہر آئین میں کم وبیش کسی حد تک پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۳ء کا آئین بھی اسی تضاد کا شکار ہے۔ دراصل مغربی جمہوری نظام کے اندر اسلامی الفاظ کی پیوندکاری کی گئی ہے۔ جو بہت ہی مہلک اور گمراہ کن اقدام ہے۔ پاکستان آج جن سیاسی اور آئینی مشکلات ومصائب سے دوچار ہے اسکی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ آئین بناتے وقت کوئی واضح پالیسی اختیار نہیں کی گئی ہے۔

مسلمانوں کی بہتری اس میں ہے کہ مغرب ہو یا مشرق وہ سب کا پیچھا چھوڑ کر قرآن وسنّت کے مطابق اپنی آئین سازی کریں، جہاں اللہ سبحانہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ صاف اور واضح الفاظ سے بیان ہو، اور جہاں سارے معاملات سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظامِ اجتماعیہ قرآن وسنت سے نہ صرف ماخوذ ہوں بلکہ ان کی روشنی میں ترقی اور رواج پائیں۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ